رشید ارشد صاحب کے مضمون

''مذہبی تجربے کی علمی و نفسیاتی ساخت''

کا جائزہ اور کچھ گزارشات

مدثر رشید

حکمتِ قرآن کے سابقہ شمارے 'جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء' میں محترم رشید ارشد صاحب کا مضمون 'مذہبی تجربے کی علمی و نفسیاتی ساخت' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے علامہ اقبال کے مذہبی تجربے کو طبیعیات کے دائرے میں لانے کی کاوش کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ایک لحاظ سے جہاں ان کی تنقید فکر انگیز ہے، تو ایک لحاظ سے یہ محلِ نظر بھی ہے۔ ذیل میں اس تنقید کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

مغربی فکر و فلسفہ کی بنیاد مادیت کے نظریے پر استوار ہوتی ہے۔ اس سوچ کے تحت ایک ورلڈ ویو بھی ترتیب دیا گیا ہے اور اسی طرح انسان کا ایک خالص مادی تصور بھی قائم کیا گیا ہے۔ اس سوچ میں مابعد الطبیعی حقائق سے زیادہ اہمیت طبیعی حقائق کی ہے۔ مذہب اور اس سے متعلق حقائق کا تعلق کیونکہ مابعد الطبیعیات سے ہے اس لیے اس کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ رشید ارشد صاحب کے نزدیک اس سوچ سے نمٹنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس جدید سوچ کو ہی رد کر دیا جائے اور اس کے برعکس مذہبی سوچ کو مسلم مان کر اس کی بنیاد پر ایک نیا ورلڈ ویو اور تصورِ انسان کھڑا کیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس جدید سوچ میں مذہبی سوچ کی گنجائش پیدا کی جائے۔ یعنی مابعد الطبیعی حقائق کو کسی نہ کسی حد تک طبیعات کے دائرے میں لانے کی کوشش کی جائے۔ یہ طریقہ وہ تھا جسے علامہ اقبال نے اپنایا۔ رشید ارشد کے نزدیک یہ موزوں طریقہ کار نہیں ہے' کیونکہ اس طرح سے مذہبی سوچ کی کچھ گنجائش تو پیدا کی جا سکتی ہے لیکن مذہب جن حقائق کو واضح طور پر تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے ان کو اس لحاظ سے ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ کاوش رائیگاں جائے گی اور مذہبی نظریات کی عقلی توجیہہ خود مذہب کے ماننے والے قبول نہیں کریں گے۔ رشید ارشد صاحب لکھتے ہیں:

> ''یہ سارا عمل دراصل جدید علمیت episteme کے غلبے کو مان لینے کے بعد شروع ہوا اور اس میں کوشش کی گئی کہ سائنس وغیرہ سے تعمیر ہونے والے جدید ذہن کے لیے مذہب اور مابعد الطبیعیات کو کم از کم اس درجے تک مانوس بنا دیا جائے کہ وہ ان کے انکار کی طرف مائل نہ ہو سکے۔''

اس طریقہ کار کی غلطی واضح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

’’انسان کے مذہبی شعور اور وجود کا اثبات کرنے کی ان کوششوں کا نصب العین یہ تھا کہ جدید تصورِ انسان میں کلاسیکی تصورِ انسان کے بعض اجزا شامل ہو جائیں اور انہیں قبول بھی کر لیا جائے۔ اس تحریک میں ایک جوہری نقص تھا‘ اور وہ یہ کہ انسان اور مذہبی حقائق کے درمیان تعلق کو ثابت کرنے کے لیے جدید تصورِ انسان کو رد نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ اسے کل مان کر مذہبیت کے بعض اجزا کی گنجائش نکالی جا رہی تھی اور ان اجزا کی placing بھی اس تصور کے مرکز میں نہیں کی جا رہی تھی بلکہ انہیں ایک ماتحت اور ثانوی حیثیت دے کر اس نئے تصور میں قدرے توسیع کی کوشش کی جا رہی تھی۔‘‘

ان کے نزدیک فلسفے کے میدان میں تو چونکہ جدید سوچ کی اصل جڑیں موجود تھیں‘ اس لیے اس میں تو گنجائش پیدا کرنا ممکن نہ تھا۔ لیکن نفسیات کے میدان میں کچھ ایسے کام کیے گئے جس سے یہ گنجائش پیدا کرنے کی صورت پیدا ہوگئی۔ اس لحاظ سے دو شخصیات نمایاں ہیں‘ یونگ اور ولیم جیمز۔ یونگ نے تجرباتی تحقیق سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مابعد الطبیعی تصورات خارج سے تو انسان میں داخل نہیں ہوتے‘ مگر ان کا وجود ہے اور یہ انسان کے عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ تصورات شعور کے اس حصے سے جنم لیتے ہیں جسے لاشعور بھی کہا جاتا ہے جو انسان کے ادراک سے باہر ہے۔ اگر یونگ کے اس نتیجے کو صحیح مان لیا جائے تو مابعد الطبیعی تصورات بشمول خدا کے تصور کو محض ایک باطنی خیال ہی ثابت کیا جا سکتا ہے‘ ایک خارجی حقیقت نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مذہبی ذہن اس تشریح کو قبول کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں‘ بلکہ مذہب میں تو خدا اور دیگر مذہبی حقائق ایک خارجی وجود رکھتے ہیں۔ رشید ارشد صاحب اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’اس پورے عمل میں مذہب جیسا کہ ہے‘ اس کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ اس سے وجودِ باری تعالیٰ اور رسالت کا ادارہ ادنیٰ درجے میں بھی define نہیں ہوتا۔ اس طرح کی انفسی مذہبیت کچھ روحانی تصورات کا جواز تو فراہم کر دیتی ہے لیکن اس سے مذہب کے تمام ڈھانچے (structures) گر جاتے ہیں اور اس نوع کی روحانیت مذہب کو پوری طرح غیر مطلوب اور غیر متعلق بنا دیتی ہے۔‘‘

ولیم جیمز کے نزدیک مابعد الطبیعی تصورات محض باطنی خیال نہیں ہیں بلکہ ان کی تشکیل خارجی حقائق سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ولیم جیمز نے مابعد الطبیعی تصورات مثلاً مذہب یا خدا کو مستند خارجی معلومات کی بنیاد پر تشکیل شدہ باطنی حقائق کے طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مسئلہ وہی ہے کہ اس کے ذریعے تو مابعد الطبیعی معلومات کا حصول ہر انسان کے لیے ثابت ہوتا ہے اور نبی اور غیر نبی کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ اس تصور کے تحت تو علم وحی بھی اسی طرح کے تجربات کی صورت میں پیدا ہونے والا علم ہے۔ اب کیا مذہبی ذہن اس کو تسلیم کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ مذہبی سوچ کے تحت تو وحی کا تعلق ان تجربات کے ساتھ نہیں ہے بلکہ یہ علم تو ان تمام تجربات سے ہٹ کر نبی کو دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود علامہ اقبال جیسے مفکرین نے ولیم جیمز کے اس استدلال کو استعمال کیا‘ بلکہ ان کے نزدیک علامہ اقبال کا فکر وہ بیانیہ ہے جو ولیم جیمز کے اصولوں پر استوار ہوتا ہے۔ رشید ارشد صاحب لکھتے ہیں:

’’اقبال کے ہاں سب سے بڑی مشکل وہی ہے جس کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا‘ وحی اور غیر وحی کا امتیاز باقی نہ

رہنا۔ نبی اور غیر نبی کے حالات اور احوال کو اپنے جوہر میں ایک سمجھنا' اور آمدِ وحی کو صوفیانہ اور نفسیاتی تجربے کی طرح کا ایک تجربہ سمجھنا۔''

اس بحث کو وہ ان الفاظ کے ساتھ conclude کرتے ہیں:

''مذہبی تجربے کو علم بنانے کی سعی کے پیچھے ایک بہت بڑا سمجھوتہ برسرِعمل دکھائی دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم نے علم کی جدید تعریف کو قبول کر لیا ہے اور مذہب کو بھی اس تعریف کے دائرے میں لانا چاہتے ہیں۔ یہ مذہب کو empiricize کرنا ہے جو کسی بھی درجے میں خود مذہب ہی کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ یہ تمام کوششیں بے بس ہو کر کی جا رہی ہیں اور ان کے نتیجے میں مذہب کو سکیڑنے کا رویہ لازماً پیدا ہوتا ہے۔ اقبال نے بھی مذہبی تجربے کو فلسفیانہ کسوٹی پر پرکھنے کا جو اہتمام کیا ہے اس میں کہیں بھی علم اور تیقن کی موجودہ ساختوں کو مسمار یا درست کرنے کی کوشش نہیں کی گئی' بلکہ انہیں معیار مان کر مذہبی حقائق و احوال کو ان کی سطح تک پہنچانے کا ڈول ڈالا گیا ہے۔ یہ فرض کرنا بھی بہت عجیب لگتا ہے کہ ایمان بالغیب کی اساس پر تعمیر ہونے والی عمارت حواس تک محدود ہو جانے والے تیقن کے دائرے میں لائی جا سکتی ہے۔ مذہبی واردات کی نفسیاتی اور عقلی تحلیل کرنے سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا کہ ہم مذہب سے تشکیل پانے والے مجموعی شعور کی روشنی میں علم اور تیقن کی موجودہ conditions کو پرکھتے اور ان کی اصالت (principalization) کا وہ اہتمام کرتے جو مذہبی شعور اور روحانی تناظر کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن ہم نے بالکل مختلف کام کیا اور اس کا نتیجہ اب بھگت رہے ہیں۔''

حاصل کلام یہ ہے کہ خدا اور مذہب جیسے مابعد الطبیعی حقائق کو جب بھی ہم اپنی محدود عقل میں لانے کی کوشش کریں گے تو ہمارے ذہن کی محدودیت ان کو لازماً محدود کر دے گی۔ اس لیے اس منہج پر جو بھی کاوش ہو گی اس سے مذہبی سوچ کی کچھ گنجائش تو پیدا ہو سکتی ہے پر اس کو 'جیسا کہ یہ ہے (as is)' ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

رشید ارشد صاحب کے اس تجزیے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے' لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پھر اس کا حل کیا ہونا چاہیے۔ رشید ارشد صاحب نے اس کے مقابلے میں جو منہج پیش کیا ہے' کیا اس کے ذریعے بھی مذہبی فکر 'جیسا کہ یہ ہے' ثابت ہو سکتا ہے؟ کیا مسلمان کسی ایسے مذہب کو قبول کر سکتا ہے جو تمام مذاہب سے مل کر 'اجتماعی مذہبی شعور' کے تحت تشکیل پایا گیا ہو؟ ہرگز نہیں۔ اس سے 'وحدتِ ادیان' کی راہ ہموار نہیں ہو گی؟ تو پھر رشید ارشد صاحب کا علامہ اقبال کے منہج پر اعتراض بے معنی ہے۔ بلکہ دعوت کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو علامہ اقبال کا منہج کلام زیادہ موزوں نظر آتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے جدیدیت سے مرعوب ذہن کو مذہبی شعور کے قریب لانے میں مدد مل سکتی ہے۔ جدید سوچ تو مذہب کی بنیاد کو عقلاً غلط ثابت کرنے کے بعد استوار ہوئی۔ اور ویسے بھی اگر آج کے دور میں ہم مذہبی شعور کو بغیر کسی دلیل کے مسلم مان کر کوئی نیا ورلڈ ویو تشکیل دینے کی کوشش کرتے ہیں تو فکر مادیت کے اس ہمہ گیر غلبے کی فضا میں یہ کلی بن کھلے مرجھا جائیگی۔ آج مادی فلسفہ وفکر کے تسلط کے دور میں اگر مذہبی شعور کو کسی درجے میں کچھ بھی مدد ملتی ہے تو غنیمت ہے۔ کچھ تو ذہن مادیت سے ہٹ کر مذہبی سوچ کی طرف متوجہ ہو گا۔ اور یہ رشید ارشد صاحب تسلیم بھی کرتے ہیں کہ اس کاوش کا کچھ فائدہ ضرور ہوا ہے۔

احقر کے نزدیک حل یہی ہے کہ ہم مذہب سے متعلق مابعدالطبیعی حقائق کو عقل کے مطابق لانے کی بجائے اگر اس کے ماخذ یعنی قرآن کو عقلاً صحیح ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر مذہب سے تشکیل پانے والے مجموعی شعور کی بجائے ٹھیٹھ اسلامی اصولوں کی روشنی میں 'علم و تیقن کی موجودہ conditions کو پرکھ کر اور ان کی اصالت principalization کا اہتمام' کر کے ایک نیا ورلڈ ویو اور تصورِ انسان تشکیل دینے کے قابل ہو سکیں گے۔ اور یہ جیسا کہ میں نے اپنے مضمون میں واضح کیا ہے کہ دلیل معجزہ ہی سے ممکن ہے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جس سے ہم دین اسلام 'جیسا کہ وہ ہے' کو صحیح ثابت کر کہ ﴿هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ﴾ کے چیلنج کے ساتھ 'اتمام حجت علی الناس' کر سکتے ہیں۔ ورنہ چاہے علامہ اقبال کا منہج ہو یا رشید ارشد صاحب کا' نتیجہ ایک نئے دین اور ایک نئی مذہبی سوچ کی صورت میں ہی نکلے گا جو خود اسلام کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔

بہرحال دعوت کے نکتہ نظر سے علامہ اقبال کے منہج کی گنجائش بنتی ہے۔ تشکیل جدید کے لیکچرز کو اگر ایک طرف رکھا جائے تو شاعرانہ کلام والا علامہ اقبال ٹھیٹھ اسلامی عقائد اور اسلامی اصولوں پر کھڑا نظر آتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال تشکیل جدید میں پیش کیے گئے نظریات کو ان اسلامی تصوّرات پر مسلّط نہیں کرتے جن کی بنیاد علمِ وحی پر ہے۔ اس کے برعکس ان کی کاوش کا مطمحِ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ' نفسیات' اور طبیعیات میں جدید رجحانات کی روشنی میں مذہبی فکر کی جتنی تائید ممکن ہو سکے کی جائے تاکہ جدید ذہن سے مغربی فکر کا رعب کچھ کم ہو۔ وہ خود ان نظریات کو حتمی نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک وقت کے ساتھ ساتھ ان پر مزید کام ہوتا رہے گا۔ تشکیل جدید کے ابتدائیے میں فرماتے ہیں:

> ''میں نے اسلام کی فلسفیانہ روایات اور انسانی علم کی جدید ترقیات کی روشنی میں اسلام کے مذہبی نظریات کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے' لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ فکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جیسے جیسے معلومات میں اضافہ ہوگا اور فکر کی نئی راہیں کھلتی جائیں گی' نئی اور زیادہ صحت مند آراء پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ انسانی فکر کے ارتقاء پر نظر رکھیں اور اس کی طرف اپنے آزاد تنقیدی رویئے برقرار رکھیں۔''
>
> (ڈاکٹر علامہ اقبال' تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (اردو ترجمہ)' دیباچہ' بزم اقبال لاہور' ۱۹۵۸)

چنانچہ اگر اقبال کی سوچ یہ ہے کہ 'مذہب کو اپنی بقاء کے لیے علمی طور پر empiricize ہونا ہوگا' تو اس سے مراد ان کی یہ نہیں ہے کہ 'مذہب اگر ہماری بنائی ہوئی دلالتوں کا مدلول نہیں ہے تو اسے ماننے کا کوئی جواز نہیں ہے' بلکہ وہ یہ اس لیے چاہ رہے ہیں کہ اس مسلم ذہن کو جس نے مغرب کے زیرِ تسلّط ایک مخصوص سوچنے کی عادات (Habits of Thought) اپنائی ہیں' دین اسلام کی طرف مائل کر سکیں۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔